مُٹھی بھر مَٹّی

(ناول)

مصنفہ: عمیرہ احمد

مٹھی بھر مٹی

میں نے جھک کر زمین پر پڑی ہوئی وہ جھنڈی اٹھالی۔ رات ہونے والی موسلا دھار بارش نے گھروں اور دیواروں پر لگی ہوئی جھنڈیوں کو زمین بوس کر دیا تھا۔ میں کچھ دیر اس جھنڈی کو دیکھتا رہا پھر میں نے اسے اپنے ٹریک سوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ اس راستے پر نظر آنے والی پہلی جھنڈی...... بہت سال پہلے میرے باپ نے پاکستان کی سرزمین پر پہلا قدم رکھتے ہی وہاں کی مٹی کو ایک رومال میں باندھ کر اسی طرح اپنی جیب میں رکھا تھا۔ مٹی کی وہ ننھی سی پوٹلی آج بھی میرے پاس محفوظ ہے اور ہر سال کسی نہ کسی سڑک سے اٹھائی جانے والی ایک جھنڈی بھی...... شاید میری کولیکشن دنیا کی عجیب ترین چیزوں پر مشتمل ہے۔ اپنے یوم آزادی کے بجائے اگلے دن کسی نہ کسی سڑک پر گری ہوئی کوئی پھٹی، مسلی، بھیگی ہوئی ایک جھنڈی پھر میں ہر اس جھنڈی کو تاریخ اور سن کے ساتھ اپنی البم میں محفوظ کر لیتا ہوں......

پچھلے بیس سال سے اسی مخصوص سڑک پر میں صبح کی سیر کے لئے آ رہا ہوں، برسات...... سردی...... گرمی...... خزاں...... بہار...... کوئی موسم، کوئی تہوار میرا معمول نہیں بدل سکا حتیٰ کہ موسلا دھار بارش اور تیز طوفان بھی۔

رات کی بارش نے ہر چیز کو گیلا کر رکھا ہے۔ تارکول کی سیاہ سڑک بھیگ کر کچھ اور چمکدار اور نمایاں ہو گئی ہے۔ سڑک کے کنارے لگے ہوئے درخت اور پودے بارش کے پانی میں دھل کر کچھ اور نکھر گئے ہیں۔ اس وقت بھی آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں اور شاید کچھ دیر بعد بارش ایک بار پھر شروع ہو جائے گی۔ برسات کی ہوا میں وہی مخصوص نمی ہے جسے پچھلے کئی سالوں سے اس موسم میں میں محسوس کرتا آ رہا ہوں۔ ہوا میں خنکی بھی ہے۔

کشمیر کی طرف سے آنے والے جھونکوں کی طرح [illegible] صبح سویرے اس سڑک پر ٹریفک غائب ہے اور اس کے ساتھ گاڑیوں کا شور بھی۔ البتہ سڑک کے کنارے لگی

ہوئی گھاس میں جمع شدہ پانی سے محظوظ ہونے والے مینڈکوں کی آوازیں اس سناٹے کو توڑ رہی ہیں اور کبھی کبھار سڑک کے کنارے لگے ہوئے درختوں کی گیلی شاخوں پر پناہ لینے والے پرندوں کی چہچہاہٹ بھی۔ یہ اس علاقے کی سب سے خوبصورت سڑک ہے اور میرا اور اس کا ساتھ اب بیس سال پر مشتمل ہے۔ بیس سال پہلے اس سڑک کے دائیں بائیں گھروں کی بہت محدود تعداد تھی، خالی پلاٹ سبزے سے ڈھکے رہتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ اس سڑک پر کوئی ایک بھی خالی پلاٹ نہیں مگر گھروں کے آگے سڑک کے کنارے گھاس اور درخت ضرور باقی ہیں۔

میں اس سڑک پر واک کرنے والا اکیلا شخص ہوں، میری عمر کے لوگ، نوجوان لڑکے، لڑکیاں، ادھیڑ عمر عورتیں، والدین کے ساتھ دس بارہ سال کے بچے...... وقتاً فوقتاً کوئی نہ کوئی میرے پاس سے گزرتا جاتا ہے۔

پورا سال میں اس سڑک پر بڑی خاموشی کے ساتھ چیزوں پر غور کیے گزرتا رہتا ہوں مگر سال میں ایک دن نوسٹیلجیا کا دن ہوتا ہے۔ اس دن میں اس سڑک سے گزرتے ہوئے ماضی کے علاوہ اور کسی چیز کے بارے میں نہیں سوچتا اور وہ آج کا دن ہوتا ہے، پندرہ اگست...... 54 سال پہلے اس تاریخ کو میں نے اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ لفظ خاندان شاید میں جذبات میں آ کر استعمال کر گیا۔ میرے ساتھ صرف میرا باپ تھا۔ سینتالیس سال کا ایک دکھ بھرا، ادھ موا قاتل...... جس قافلے میں میں پاکستان آیا تھا اس میں کم از کم چھ قاتل تھے۔ باقی کے لوگ کیا تھے یہ میں نہیں جانتا۔

سڑک پر چلتے ہوئے لوگوں کا پہلا گروپ میرے پاس سے گزرنے والا ہے۔ ان کی آوازیں میرے کانوں میں پڑ رہی ہیں۔ "2025ء تک پاکستان تقسیم ہو جائے گا پچھلے تین سالوں سے امریکن تھنک ٹینک یہی رپورٹ دے رہے ہیں اور ان کے اندازے صحیح ثابت ہوتے ہیں۔"

"2025ء تو بہت دور ہے، جس طرح کے حالات ہیں یہ کام تو اس سے پہلے ہی ہو جائے گا۔" تین لوگوں کا میرا ہم عمر گروپ اب میرے پاس سے گزر رہا ہے، ہم نے سر کے اشارے اور مسکراہٹوں سے سلام و دعا کا تبادلہ کیا اور ایک دوسرے کے پاس سے گزر گئے۔

"2025ء میں پاکستان ٹوٹ جائے گا۔"

گیلانی صاحب کا جملہ میرے ذہن میں اٹک گیا ہے۔

میں چودہ سال کا تھا جب میں اپنے باپ کے ساتھ پاکستان آیا، ہندوستان کی تقسیم

کے بعد میرے باپ کا تعلق پٹیالہ سے تھا۔ وہ زمیندار تھا، تین بہنوں اور دو بھائیوں پر مشتمل ہمارا گھرانہ اس علاقے کے بہت کم مسلمان گھرانوں میں سے ایک تھا۔ ہم لوگ وہاں بڑے سکون کی زندگی گزار رہے تھے۔ تحریک پاکستان کا آغاز ہونے کے بعد بھی ہم لوگوں کو کوئی زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا کیونکہ جس گاؤں میں ہم تھے وہاں کی اکثریت ان پڑھ لوگوں پر مشتمل تھی۔ انہیں ملکی سیاست کے بارے میں زیادہ معلومات تھیں نہ دلچسپی۔ لیکن آہستہ آہستہ تحریک پاکستان میں شدت کے ساتھ ہی چوپال میں شام کو سیاست اور جناح کا یہ مطالبہ زیر بحث لایا جانے لگا میرا باپ بھی ان مسلمانوں میں شامل تھا جو اس مطالبے کو ایک حماقت سمجھتے تھے۔

"یعنی اپنی ساری زمینیں چھوڑ کر میں پاکستان چلا جاؤں کیونکہ وہ ملک مسلمانوں کے لیے ہے۔ جناح کا دماغ خراب ہے۔ کوئی اپنی مٹی چھوڑ کر جاتا ہے۔ کوئی اپنا گھر بار اور زمینیں چھوڑ کر صرف مذہب کے لیے کہیں چل پڑے۔"

مجھے یاد ہے میرا باپ کئی سال یہی بات رات کو گھر میں ماں کے سامنے دہرایا کرتا تھا اور گھر میں موجود سب لوگ اس کے ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔ جب زندگی سکون سے گزر رہی ہو تو پھر اس طرح کے مطالبات حماقت کے علاوہ کچھ بھی نہیں لگتے۔

میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا اور میرا بھائی سب سے بڑا تھا تینوں بہنیں دونوں کے درمیان آئی تھیں۔

گاؤں میں جب بھی مسلم لیگ والے مسلم لیگ کے لئے کنویسنگ کرنے کے لیے آئے، میرے باپ نے بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح ان کا مذاق اڑایا۔

"تم لوگوں کو ووٹ دیں؟ کیوں ووٹ دیں، بٹوارہ کرنا چاہتے ہو تم لوگ...... مصیبتیں بڑھانا چاہتے ہو ہماری۔ کانگریس ہے ہماری بات سننے والی۔ ہمارے لیے وہی کافی ہے۔"

میرے باپ نے ہر دفعہ لیگیوں کو اسی طرح دھتکارا۔ کئی بار لیگیوں کے گھر گھر جاکر عوام رابطہ مہم کے دوران میرے باپ نے گھر کا دروازہ ہی نہیں کھولا۔ وہ لوگ دروازہ بجاتے، تھک کر اگلے گھر چلے جاتے۔

میرے باپ کی سوچ میں تب بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی جب اس نے میرے بڑے بھائی کو ہائی اسکول کے بعد آگے تعلیم کے لیے جالندھر بھجوایا۔ گھر میں صرف میں اور میرا بھائی ہی تھے جنہیں تعلیم دلوائی جا رہی تھی۔ میری بہنوں کو اس نے تعلیم نہیں دلوائی تھی۔ اس علاقے میں عورتوں کو تعلیم دلوانے کا رواج نہیں تھا اور پھر مسلمان عورتوں کے لیے تو تعلیم شجر ممنوعہ کا درجہ

رکھتی تھی۔ میری ماں اور بہنیں گھر کے اندر بند رہنے والی عورتیں تھیں۔ ماں کبھی کبھار باپ کے ساتھ کھیت پر چلی جاتی مگر بہنوں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا۔ میرا باپ ویسے بھی ایک خوشحال زمیندار تھا جسے گھر کی عورتوں کو کھیتوں پر کام کروانے کی احتیاج نہیں تھی۔

شہر میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران ہی میرے بڑے بھائی کی سوچ میں تبدیلی آنا شروع ہو گئی۔ اب وہ جب بھی چھٹیوں میں گھر آتا تو مسلم لیگ کی بات کرتا، جناح کے گن گاتا، مسلمانوں کے حقوق پر بولتا۔ دو قومی نظریہ کے حق میں دلیلیں دیتا۔ وہ اپنے کالج کے بہت سے دوسرے مسلمان طلبہ کے ساتھ جناح کی تقریریں سننے جایا کرتا تھا اور شاید یہ Metamorphosis (کایاپلٹ) وہیں ہوا تھا۔

"ان کی آواز میں جادو ہے، وہ بات کرتے ہیں تو ہندو لیڈرز کو لرزا دیتے ہیں، ان کی دلیلوں کے پرخچے اڑا کر رکھ دیتے ہیں۔ آپ لوگ تو گھروں کے اندر رہتے ہیں، آپ کو کیا پتا شہروں میں انگریز اور ہندو مسلمانوں کے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔ آج ہندو انگریز کے پالتو کتے کا کام کر رہا ہے۔ انگریزوں کے جانے کے بعد ہندو انگریز کی جگہ لے گا اور مسلمان ہندو کی اور کم از کم میں تو کسی پالتو کتے کا کردار ادا کرنے کو تیار نہیں۔"

میرا بڑا بھائی مظفر چولہے کے پاس چوکی پر بیٹھ کر روٹی کھاتا اور ساتھ بولتا جاتا۔ میری تینوں بہنیں میں اور ماں اس کے گرد بیٹھے اسے مرعوب انداز میں دیکھتے رہتے۔ میری بڑی بہن شکیلہ اسے پورا وقت پنکھا جھلتی رہتی۔ ماں گرم گرم روٹیاں اس کے سامنے اتار کر رکھتی جاتی۔ منجھلی بہن صغریٰ سالن کم ہوتے ہی کٹورہ بھر دیتی۔ چھوٹی بہن مسلسل پانی کا گلاس دیکھتی رہی کہ وہ خالی ہو تو اسے برق رفتاری سے بھرے اور میں...... میں صرف اس کی باتیں، اس کی آواز کا اتار چڑھاؤ، اس کے چہرے کا بدلتا ہوا رنگ دیکھتا رہتا۔ جناح کون تھا؟ مسلم لیگ کیا کام کر رہی تھی؟ دو قومی نظریہ کیا تھا؟ اور پاکستان کیا تھا؟ یہ ہم سب نے مظفر سے جانا تھا۔

وہ ہر بار نئی خبروں کے ساتھ واپس آتا۔ ہر بار اس کی آواز میں پہلے سے زیادہ جوش ہوتا۔ آنکھوں میں پہلے سے زیادہ چمک ہوتی، چہرے پر پہلے سے زیادہ سرخی ہوتی اور جھولی میں پہلے سے زیادہ خواب ہوتے۔

میرا باپ گھر کا واحد شخص تھا جو مظفر کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ اسے گھر میں سب سے زیادہ مظفر سے محبت تھی یہی وجہ تھی کہ وہ اسے ڈانٹتا نہیں تھا مگر اس کی ہر بات کے جواب میں وہ کہتا۔

"تم اس شخص کی تقریروں کی بات کرتے ہو جسے کافر قرار دیا جا چکا ہے۔ کوئی

مولوی اسے مسلمان ماننے کو تیار نہیں، سب کہہ رہے ہیں جناح پاگل ہے، کافر ہے، مسلمانوں میں تفرقہ پھیلا رہا ہے۔ میں تو ان لوگوں کی بات سنوں گا اور اسی پر عمل کروں گا، جناح کی نہیں۔''

میرے باپ کی ایک ہی رٹ ہوتی، چوپال میں اب سیاست پر ہی بات ہوتی تھی۔ ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں بحثیں ہوتیں، مسلم لیگ اور کانگریس کے بارے میں بات ہوتی۔ گاندھی، نہرو، مولانا عبدالکلام آزاد اور جناح، جوہر اور لیاقت علی خان کا موازنہ کیا جاتا۔ مسلم لیگ اور اس کے لیڈرز کو گالیاں دی جاتیں میرا باپ بھی انہی مسلمانوں میں شامل ہوتا جو اسے گالیاں دیا کرتے تھے۔

1940ء کا عشرہ چل رہا تھا۔ میری بڑی بہن کی منگنی میرے ماموں زاد کے ساتھ ہو چکی تھی۔ کچھ عرصہ تک شادی ہونے والی تھی۔ مگر پھر میرے ماموں زاد نے پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا، شادی ملتوی ہو گئی۔ طے یہ پایا کہ وہ تعلیم مکمل کرلے پھر شادی کی جائے گی۔

ان ہی دنوں پنجاب کے کچھ علاقوں میں مسلمانوں کے خلاف بڑے پیمانے پر قتل و غارت کی گئی، چوپال میں یہ خبریں بھی پہنچتیں۔

''ہاں تو جو لوگ غلط کام کرتے ہیں ان کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ لوگ کیوں مسلم لیگ کے گن گاتے پھرتے ہیں۔ نہ یہ مشتعل کرنے والے کام کریں نہ مارے جائیں۔'' سکھ پنچ نے ان فسادات پر چوپال میں بیٹھ کر یہ تبصرہ کیا۔

''مگر اس طرح پورے کے پورے گھر کو جلا دینا اور خاندان قتل کر دینا کہاں کا انصاف ہے۔ قتل تو نہیں کرنا چاہیے۔ وہ جو بات کہتے ہیں سن لیں اور ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیں۔ لیکن مار دینا...... یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔''

پہلی بار میرے باپ نے چوپال میں بیٹھ کر ایسی بات کہی۔

''کیوں انصاف نہیں ہے، یہ فسادی لوگ ہیں ان کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ بٹوارہ کرنا چاہتے ہیں یہ...... گھر میں دیوار اٹھا دینا چاہتے ہیں...... ٹھیک کیا اگر ایسوں کو مارا۔''

چوپال میں بیٹھے ہوئے ایک ہندو نے کہا اور وہاں بیٹھے سب لوگوں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ میرا باپ خاموش ہو گیا۔

1945ء کا سال شروع ہو چکا تھا۔ **1945**ء اور **1946**ء کے دسمبر جنوری میں انتخابات منعقد ہوئے اور یہ وہ انتخابات تھے جن میں میرے بھائی مظفر نے مسلم لیگ کے اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا کام کرتے ہوئے مسلم لیگ کے امیدواروں کی کنویسنگ کی۔ وہ اپنے

علاقے سے انتخاب لڑنے والے مسلم کے امیدواروں کے لیے علاقے کے تمام مسلمانوں کے گھر جاتا رہا اور وہاں کے ہندوؤں اور سکھوں کی نظروں میں آ گیا۔

چوپال میں پہلی بار میرے باپ کو اس کے بیٹے کی سرگرمیوں پر سرزنش کی گئی۔ میرا باپ خاموش رہا۔ وہ کیا کہہ سکتا تھا، الزامات سچ تھے۔ اس رات گھر آ کر اس نے پہلی بار میرے بھائی کو ڈانٹا۔ ''نہیں ابا! یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے اس بار گھر نہیں بیٹھ سکتا۔ اس بار اگر مسلم لیگ کے ساتھ الیکشنز میں وہ سب کچھ ہوا جو پچھلے الیکشنز میں ہوا تھا اور وہ اتنی بری طرح ہاری جس طرح پچھلی بار ہاری تھی تو ہم سب کچھ ہار جائیں گے۔ انگریز ہمیں ہندوؤں کے حوالے کر کے چلے جائیں گے اور پھر کوئی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ اس بار اگر ہم نے مسلم لیگ کا ساتھ نہ دیا تو پھر اگلے کئی سو سال غلامی گزاریں گے اور اس بار غلامی پہلے سے زیادہ بدتر ہو گی۔''

میں نے زندگی میں کبھی اپنے بھائی کو اتنی بلند آواز میں اپنے باپ سے بات کرتے نہیں دیکھا تھا، مگر اس رات وہ بولتا رہا۔ میرے باپ کی کوئی دلیل اسے قائل نہیں کر سکی۔ جمعیت علمائے ہند کے بیانات کے حوالے بھی اسے متاثر نہیں کر سکے۔

''جو لوگ آج جناح کو کافر کہتے ہیں، وہ کل جناح کا ہاتھ چوما کریں گے اور اس کا مزار بنا کر اس پر فاتحہ پڑھا کریں گے۔ جو لوگ آج پاکستان کے مطالبے کو ذہنی فتور کہتے ہیں اور اسے گالیاں دیتے ہیں، وہ کل اسی پاکستان میں پناہ لینے کے لیے بھاگیں گے۔ جناح کافر نہیں ہے وہ پریکٹیکل مسلمان ہے۔ مولویوں کی طرح دین کی بات نہیں کرتا، دین پر عمل کرتا ہے۔ یہ وہ مولوی ہیں جو پچھلے سو سال میں ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریز کی غلامی سے آزاد نہیں کروا سکے اور اب جو آزادی کی بات کر رہا ہے وہ شخص ان کو کافر نظر آتا ہے۔ یہ لوگ دستاریں اور چغے پہن کر بھی میرے لیے اگر آزادی نہیں لا سکے تو مجھے اس شخص کے پیچھے کھڑے ہونے دیں جو پینٹ کوٹ پہن کر اور سگار پی کر مجھے وہ زمین دلا دے گا، جہاں میں مسجد میں بلند آواز میں اذان دوں تو میرا سر کاٹنے کے لیے ہندو اندر نہ آ جائیں۔''

میرا باپ بول نہیں سکا، وہ اس کے بعد بھی کبھی میرے بھائی کے سامنے بول نہیں سکا۔

مسلم لیگ نے **1945**ء اور **1946**ء کے انتخابات میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی اور وہ مسلمانوں کی تقریباً تمام سیٹیں جیت گئی۔

کانگریس کے ٹکٹ پر کھڑے ہونے والے مسلمان امیدوار ہمارے علاقے میں بری طرح ہار گئے۔ الیکشنز میں جیت کے بعد مسلم لیگ کے مطالبے میں اور بھی شدت آ گئی۔ برٹش حکومت اب مسلم لیگ کو پہلے کی طرح نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔

چوپال میں میرے باپ کے لیے ناپسندیدگی اور بڑھ گئی۔ میرے بھائی کے خلاف باتیں کی جاتیں، میرا باپ اگر بڑا زمیندار نہ ہوتا تو شاید اب تک اسے چوپال سے نکال دیا جاتا مگر اب بھی وہ ایک طرح کے سوشل بائیکاٹ کا شکار تھا حالانکہ وہ اب بھی کانگریس کی بات کرتا تھا اور اس نے الیکشن میں کانگریس کے حامی امیدوار کو ہی ووٹ دیا تھا۔ اس کے باوجود چوپال میں کوئی بھی اس سے خوش نہیں تھا۔

3 رجون 1947ء کو تقسیم ہند کا اعلان کر دیا گیا۔ میرا بھائی اس خبر پر خوشی سے پاگل ہو کر گھر آیا تھا۔ میرا باپ ہمیشہ کی طرح ناخوش تھا۔

''اب ہم پاکستان چلے جائیں گے۔ وہاں مغربی پنجاب میں رہیں گے۔ آپ لوگ انتظامات شروع کر دیں۔'' اس نے میرے باپ سے کہا۔

''میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ یہاں میری زمینیں اور گھر بار ہے میں کوئی احمق ہوں جو انہیں چھوڑ جاؤں۔ پھر یہاں ہمیں تکلیف کیا ہے۔''

میرے باپ نے ہمیشہ والا جواب دیا۔

''ہم وہاں کلیم داخل کروائیں تو زمینیں اور گھر ہمیں وہاں بھی الاٹ ہو جائے گا۔'' میرے بھائی نے باپ کو سمجھایا مگر وہ رضامند نہیں ہوا۔

''ٹھیک ہے آپ مت جائیں مگر میں پاکستان میں ہی رہوں گا۔'' میرے بھائی نے اعلان کیا میرے باپ نے پھر بھی اس کی بات پر کان نہیں دھرے۔

تیسرے دن میرے بھائی کو واپس شہر جانا تھا۔ میرے باپ نے اس سے کہا کہ وہ اگلے دن میری ماں اور بڑی بہن کو ساتھ والے گاؤں میں چچا کے گھر چھوڑ آئے۔ میری چچا زاد کی شادی ہونے والی تھی اور میری ماں بڑی بہن کے ساتھ وہاں جاتی پھر اسے رہنے کے لیے چھوڑ کر اسی دن بھائی کے ساتھ واپس آ جاتی۔

وہ تینوں چچا کے گھر کبھی نہیں پہنچ سکے۔ گاؤں کے باہر جانے والے رستے پر میری ماں اور بھائی کو بڑی بے رحمی کے ساتھ ذبح کر دیا گیا۔ میرے بھائی کے جسم کے کئی ٹکڑے کر کے وہاں پھینک گئے ہاں البتہ میری ماں پر رحم کیا گیا، اس کی صرف گردن کاٹی گئی جسے ایک درخت پر لٹکا دیا گیا تھا۔ میری بڑی بہن شکیلہ کا اس دن کچھ پتہ نہیں چلا البتہ تین چار دن بعد گاؤں کے قریبی جنگل میں اس کی بے لباس لاش انتہائی بری حالت میں ملی تھی۔ اسے صرف جنگلی جانوروں نے نہیں ادھیڑا تھا انسانی جانوروں نے بھی بھنبھوڑا تھا۔

✻

سڑک پر چلتے ہوئے مجھے ٹھوکر لگی۔ میں نے بے اختیار خود کو سنبھالا اور آنکھوں پر لگائی ہوئی عینک کو ٹھیک کیا۔ اب ہلکی ہلکی ہوا کچھ تیز ہو گئی ہے، بادل پہلے سے زیادہ گھنے ہو گئے ہیں۔ سامنے سڑک پر دو ٹین ایجر لڑکے جاگنگ کرتے ہوئے آ رہے ہیں۔ ٹی شرٹس اور شارٹس میں ملبوس...... میں ان دونوں کو بھی پہچانتا ہوں، وہ روز مجھے تقریباً یہیں ملتے ہیں۔ پچھلی رات کے کسی نہ کسی انڈین پروگرام یا انڈین مووی اسٹار کو ڈسکس کرتے۔ آج بھی ان کا موضوع یہی ہے۔ میں ان کی آوازیں سن رہا ہوں۔ پھولے ہوئے سانس کے ساتھ۔

''اے آر رحمان یار کیا کمال کرتا ہے یہ بندہ، رات کو وندے ماترم لگا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا دل پر بیٹ پڑ رہی ہے۔ سارا دن پاکستانی چینلز پر پروپیگنڈہ سنتا رہا۔ وہی بکواس...... وہی گانے...... یہ لوگ لبرل ہونا نہیں چاہتے۔ چاہتے ہی نہیں کہ ہمارے اندر سے یہ Prejudice (تعصب) ختم ہو...... ہر چیز ہماری اور ان کی کامن ہے حتیٰ کہ آزادی کے دن بھی ساتھ ساتھ ہیں۔ پھر بھی یہ چاہتے ہیں ہم ہر وقت ہاتھ میں تلوار پکڑے رکھیں۔ میں تو کہتا ہوں

''Across the borders we are one''

اس کی بات جاری تھی مگر وہ دونوں میرے پاس سے گزر چکے تھے، میں اب ان کی آواز نہیں سن سکتا مگر اس کا جملہ ''Across the borders we are one'' اب بھی فضا میں بازگشت بن کر پھر رہا ہے۔ سب کچھ کامن ہے، ہر چیز ایک جیسی ہے۔

Prejudice (تعصب)...... پروپیگنڈہ...... بکواس...... میں نے اپنے قدم تیز کر دیے۔



میں آج تک یہ سمجھ نہیں پایا کہ میرے باپ نے اتنے بڑے حادثے کے بعد اپنا ذہنی توازن کیوں نہیں کھویا...... مظفر سے زیادہ اسے کسی سے محبت نہیں تھی۔ میں نے خود نہیں دیکھا مگر دیکھنے والے کہتے ہیں میرے باپ نے میرے بھائی کی لاش کے تمام ٹکڑے خود اکٹھے کیے تھے، بے حس آنکھوں کے ساتھ...... کسی چیخ و پکار کے بغیر۔ اس نے میرے بھائی کا پورا جسم اکٹھا کیا، وہ ہر چکر کے بعد جسم کے ٹکڑے دوبارہ گنتا پھر جو ٹکڑے کم ہوتے ان کے نام دہراتا۔ دائیں ٹانگ...... ناک...... بایاں کان...... بایاں ہاتھ...... ہاتھ کا انگوٹھا...... دائیں ہاتھ کی چار انگلیاں......

ہاتھ کی دو انگلیاں وہ آدھ گھنٹہ ڈھونڈتا رہا۔ جب وہ مل گئیں تو اسے جیسے قرار

آ گیا۔ اب اس کے بیٹے کا جسم مکمل نہیں رہا تھا۔ وہ جسم کا ہر ٹکڑا اٹھا کر اس پر لگی ہوئی گرد اور مٹی صاف کر دیتا اگرچہ وہ خون خشک نہیں کر پاتا تھا مگر وہ سارے ٹکڑے اور مٹی کو ضرور صاف کر دیتا۔ اس کے کندھے پر لٹکا ہوا کپڑا اس خون آلود مٹی اور تنکوں سے بھر گیا تھا۔ میرے بھائی کی عمر اس وقت صرف بیس سال تھی، پورا گاؤں جانتا تھا کہ وہ شریف اور ہر ایک کی عزت کرنے والا تھا۔ اسے کبھی کسی نے جھگڑتے نہیں دیکھا تھا۔ مسلم لیگ کے لیے کام کرنے کے علاوہ اس نے زندگی میں کوئی جرم نہیں کیا تھا اور یہ کوئی معمولی جرم نہیں تھا۔ کم از کم اس زمانے میں اتنی بے رحمی کے ساتھ قتل ہونے کے لیے صرف دو چیزیں کافی تھیں۔ مسلمان ہونا اور مسلم لیگ کا حامی ہونا، اور بدقسمتی سے میرے بھائی میں دونوں خصوصیات تھیں۔

میرے بھائی کے جسم کے ٹکڑے اکٹھے کرنے کے بعد میرے باپ نے درخت سے میری ماں کا سر اتارا تھا۔ پھر وہ دونوں لاشیں گھر لے آیا۔ میں اور میری دونوں بہنیں سکتے میں آ گئے تھے۔ اگرچہ میرے باپ نے ہم تینوں کو وہ لاشیں دیکھنے نہیں دیں۔ اس نے سوچا ہو گا کہ ہم تینوں کو خوف اور صدمے کے مارے کچھ...... میں اس وقت چودہ سال کا تھا، میری چھوٹی بہن ساڑھے پندرہ سال کی تھی اور منجھلی بہن سترہ سال کی۔

بھائی کی لاش کو میرے باپ نے خود غسل دیا۔ غسل دینے کے بعد اس نے ایک سفید چادر پر اس کے جسم کے ٹکڑے رکھے اور اس کے اوپر دوسری سفید چادر ڈال کر دونوں چادروں کو چاروں جانب سے سی دیا۔ میں نے اپنے باپ کو کبھی سوئی ہاتھ میں نہیں لیتے دیکھا، ٹانکے کیسے لگاتے ہیں، یہ وہ نہیں جانتا تھا۔ بہر حال اس دن ان چادروں کو اس نے خود ہی سیا تھا۔ کیسے سیا ہو گا۔ میں نہیں جانتا کیونکہ اس نے یہ کام اکیلے کمرے میں بند ہو کر کیا تھا۔ جب کمرے کا دروازہ کھلا تو ہم نے صرف وہ سفید بوری سی دیکھی جو اب بھی جگہ جگہ سے خون سے تر ہو رہی تھی۔

اپنی اڑسٹھ سالہ زندگی میں، میں نے آج تک کسی کو ویسا کفن پہنے نہیں دیکھا۔ میری دونوں بہنیں زار و قطار رو رہی تھیں گھر میں...... میں خوف زدہ تھا...... یہ سب کیوں ہوا تھا؟ کیسے ہوا تھا؟ کس نے کیا تھا؟ ان سے بڑا سوال میرے لیے یہ تھا کہ شکیلہ باجی کہاں ہیں؟

میرے اس سوال کا جواب چڑھتے دن مل گیا، جب میرا باپ جنگل سے ان کی لاش لایا تھا۔ ہم نے ان کا چہرہ بھی نہیں دیکھا شاید...... وہ بھی دیکھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

"تمہیں منع کیا تھا کہ اپنے بیٹے کو ایسے کام مت کرنے دو۔ تم نے بات نہیں سنی۔ اب ہم تمہارے لیے کیا کر سکتے ہیں؟ تم تو جانتے ہو جوان خون گرم ہوتا ہے۔ لڑکوں کو بڑا

غصہ تھا تمہارے بیٹے پر...... جوش میں کر بیٹھے یہ سب کچھ...... اب صحیح پتا بھی نہیں ہے کہ کس کس نے حصہ لیا اس کام میں...... اس لیے پولیس کو کیا بتاتے۔ تم بس بھول جاؤ یہ سب کچھ...... ہمیں بڑا دکھ ہے جو کچھ تمہارے گھر والوں کے ساتھ ہوا ہے مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ غلطی تمہارے بیٹے ہی کی ہے...... جس نے ایک غلط کام کی ابتدا کی۔"

گاؤں کے سرپنچ سردار جوگندر سنگھ نے میرے باپ کی دادرسی ان الفاظ میں کی تھی۔

"غلط کام......" شاید میرے باپ نے پہلی بار وہاں بیٹھ کر غلط کام کی تعریف کے بارے میں سوچا ہو گا اور شاید...... اس دن ہی پہلی بار گھر آتے ہوئے اس نے راستے میں کھڑے ہندو اور سکھ لڑکوں کو دیکھا ہو گا۔ ان کے قہقہوں پر غور کیا ہو گا اور پھر شاید یہ اندازہ لگانے کی کوشش بھی کی ہو گی کہ ان میں سے کس نے اس کی بیوی کی گردن کاٹی۔ کتنوں نے اس کے بیٹے کے ٹکڑے کیے اور کس کس نے اس کی بیٹی...... بہر حال وہ گھر آ گیا تھا، خاموشی اور بے بسی کے ساتھ...... جھکے ہوئے کندھوں اور خالی آنکھوں کے ساتھ...... خاموش زبان اور لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ...... پھر اس دن کے بعد وہ دوبارہ کبھی گھر سے باہر نہیں نکلا نہ ہی ہم تینوں میں سے کوئی کہیں گیا۔

وہ پنجاب کی تقسیم کا انتظار کر رہا تھا۔ منتظر تھا کہ اسے یہ پتا چل جائے کہ اس کا علاقہ پاکستانی پنجاب میں شامل ہو گا یا ہندوستانی پنجاب میں۔

پھر یہ پتا چل گیا کہ ہمارا علاقہ پاکستان کے ساتھ شامل نہیں ہو گا۔

"ہم لوگ پاکستان جائیں گے" ایک رات میرے باپ نے مجھ سے کہا...... تب تک ساتھ والے دونوں گاؤں میں مسلمانوں کے گھر لوٹے جا چکے تھے اور ہمارے گاؤں کے مسلمان ہجرت کی تیاریوں میں تھے......

"تم اور میں......" میں اپنے باپ کی بات پر حیران رہ گیا۔ "اور صغریٰ اور سلمٰی وہ نہیں جائیں گی؟" میں نے اپنے باپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔

"نہیں......" مجھے خوف آنے لگا۔ "آپ انہیں یہاں چھوڑ جائیں گے؟"

"نہیں......"

میں الجھ گیا۔

"میں...... میں انہیں مار دوں گا۔"

میں بول نہیں سکا۔ چودہ سال کا ایک بچہ یہ سن کر کیا بول سکتا ہے کہ اس کا باپ اس کی دونوں بڑی بہنوں کو قتل کرنے والا ہے۔

''میں نہیں ماروں گا تو کوئی اور مار دے گا......'' وہ اب رو رہا تھا۔

میں پوری رات سو نہیں سکا۔ مجھے لگا کہ میں سوؤں گا اور میرا باپ میری بہنوں کو قتل کر دے گا۔ میرے باپ نے اس رات میری بہنوں کو قتل نہیں کیا۔ یہ کام اس نے اگلی رات کیا۔

☼

مجھے ہلکی ہلکی پھوار اپنے جسم پر گرتی محسوس ہوئی۔ بارش شروع ہو چکی ہے۔ میں جانتا ہوں آہستہ آہستہ برسات کی یہ بارش تیز ہو جائے گی مگر مجھے اس سے کوئی خوف نہیں آ رہا۔ اس سڑک پر چلنے والے سب لوگ ہی بارش سے محظوظ ہو رہے ہیں۔ سامنے سے اب دو عورتیں آ رہی ہیں، شاید وہ اب واپس گھروں کو جا رہی ہیں۔ میں ان کو بھی پہچانتا ہوں۔

''اس ملک میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اصلاح نے تو کینیڈا امیگریشن کے لئے اپلائی کیا ہوا ہے۔ بس چند ہفتوں تک سارا کام ہو جائے گا پھر ہم سب وہیں جا کر سیٹل ہو جائیں گے۔ پاکستان میں تو اب مجبوری میں ہی رہا جا سکتا ہے۔ میرا سارا میکہ اور سسرال امریکہ اور کینیڈا شفٹ ہو چکا ہے۔ بس اصلاح تھے جو یہاں اٹکے ہوئے تھے۔ ان کی حب الوطنی ختم کرتے کرتے خاصا وقت لگ گیا مجھے......'' وہ ہنسی۔

''چلو دیر آید درست آید......'' دوسری عورت نے بھی قہقہہ لگایا۔ وہ دونوں بھی میرے قریب سے گزر گئی ہیں۔

''اس ملک میں کچھ بھی نہیں ہے۔''

اس عورت کا جملہ میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔ وہ عورت وہ جملہ کہنے والی واحد عورت نہیں ہے۔ پچھلے کئی سالوں سے یہ جملہ بہت سے لوگوں سے سن رہا ہوں۔

''کسی بھی ملک میں کچھ نہیں ہوتا۔ ہر ملک زمین کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے اصل چیز اس زمین کے ٹکڑے پر بسنے والے لوگوں میں ہوتی ہے۔ کمی ہمیشہ ان لوگوں میں ہوتی ہے اور یہ نامی اس ملک کا تعارف بن جاتی ہے۔ ایسا سائن بورڈ جسے پھر وہ ملک اٹھائے پھرتا ہے۔''

میں نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ یہ بات مجھے کس نے کہی تھی اور مجھے یاد آ گیا کہ یہ بات کس نے کہی تھی۔

☼

میرے باپ نے اگلے دن صحن کے ایک کونے میں اس چھری کی دھار کو تیز کیا جس سے ہر سال بکرے ذبح کیے جاتے تھے۔ وہ کندھے پر پڑے ہوئے کپڑے کے ساتھ اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو صاف کرتا جاتا اور پتھر پر چھری کو رگڑتا جاتا۔ میں ایک

دفعہ اسے چھری ہاتھ میں لیے دیکھ کر کمرے میں آ گیا اور پھر باہر نہیں گیا۔ چارپائی پر بیٹھے میں اپنی دونوں بڑی بہنوں کو کمرے میں آتے جاتے دیکھتا رہا۔ وہ دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔

اس دن میں نے ایک لمحہ کے لئے بھی ان کے چہروں سے نظریں نہیں ہٹائیں۔ میں جانتا تھا زندگی میں دوبارہ کبھی میں ان چہروں کو نہیں دیکھ سکوں گا۔ وہ رات کو سو گئیں تو میرے باپ نے مجھے کمرے سے باہر جانے کے لیے کہا۔ میں کپکپاتے ہوئے باہر آ گیا، کچھ دیر بعد میرا باپ بھی باہر آ گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں چھری تھی مگر چھری پر خون نہیں تھا۔ میں خشک لبوں کے ساتھ باپ کو دیکھتا رہا۔ ''میں انہیں مار نہیں سکا...... میں اپنے ہاتھ سے انہیں مار نہیں سکتا۔ میں گھر کو جلا دیتا ہوں وہ اس کے ساتھ ہی جل جائیں گی۔'' میرے باپ نے کانپتی آواز میں کہا۔

اس نے ان کی چارپائیوں کے گرد مٹی کا تیل چھڑک دیا اور پھر آگ لگا کر دروازہ بند کر دیا۔ صحن میں کھڑے ہو کر میں نے اپنی بہنوں کی چیخیں سنی تھیں یا پھر شاید چتا جلتے دیکھی تھی ہم لوگ تب تک وہاں کھڑے رہے جب تک آگ کے شعلے پوری طرح بھڑکنے نہیں لگے پھر میں صحن میں بیٹھ کر بلند آواز میں رونے لگا۔ ان بہنوں نے مجھے اپنی گود میں کھلایا تھا، میں نے ان کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا تھا۔ اب ان کی چیخیں...... ان کی چیخیں......

''یہ جلدی مر جائیں، جلدی مر جائیں، جلدی مر جائیں۔'' میں زمین پر بیٹھا بلند آواز میں دعا کر رہا تھا...... پھر...... آہستہ آہستہ آگ نے پورے کمرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور...... اور...... چیخیں دم توڑ گئیں۔

تب میرے باپ نے مجھے اور اس گٹھڑی کو لیا جو اس نے پہلے ہی تیار کر کے رکھی تھی اور ہم راتوں رات وہ جگہ چھوڑ گئے ہم دونوں ایک گھوڑے پر سوار تھے جسے میرا باپ دوڑا رہا تھا اور میں اس کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ فجر کے وقت ہم کسی گاؤں میں داخل ہوئے، جہاں اور بھی بہت سے لوگ تھے اور ان میں وہ چھ قاتل بھی تھے۔ ویسے ہی قاتل جیسا میرا باپ تھا۔

اس کے بعد کیا ہوا...... وہی جو ہر قافلے کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایک لمبا سفر طے کر کے ہم جس دن پاکستان میں داخل ہوئے۔ وہ پندرہ اگست کا دن تھا اور لاہور کا بارڈر تھا اور تب میرے باپ نے زمین سے مٹی کی ایک مٹھی اٹھا کر اس رومال میں رکھی جو وہ ہر وقت کندھے پر لیے رہتا تھا اور جس سے اس نے میرے بھائی کے جسم سے گرد صاف کی تھی اور پھر اس کی ایک پوٹلی سی بنا کر اس نے اپنی جیب میں رکھ لی...... اور...... اور...... اس کے بعد

میرا باپ دھاڑیں مار مار کر زمین سے سر ٹکرا ٹکرا کر روتا رہا۔

میں نے اسے بھائی، ماں اور شکیلہ باجی کے ساتھ ہونے والے حادثے پر بھی اس طرح روتے نہیں دیکھا تھا، تب وہ صرف آنسو بہاتا رہا تھا۔ مگر اس دن وہ بلند آواز میں چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ وہاں میرے علاوہ کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا وہاں اس کے علاوہ بھی اور بہت سے رونے والے تھے۔ صرف میں تھا جو زمین پر بیٹھا گیلی آنکھ کے ساتھ باپ کی دیوانگی دیکھتا رہا۔ اب اتنے سالوں بعد میں سوچتا ہوں کہ وہ کیوں رویا تھا۔ کیا اسے اپنا خاندان یاد آیا تھا۔ زمینیں اور گھر بار یاد آ رہا تھا یا پھر......

میں نے اس کے بعد اپنے باپ کو کبھی روتے نہیں دیکھا...... بڑی سے بڑی مصیبت یا تکلیف پر بھی نہیں......

ہم کیمپ میں رہنے لگے۔ ہم نے کلیم جمع کروایا، ہمیں زمین اور گھر الاٹ ہو گیا۔ میرے باپ نے مجھے لاہور پڑھنے کے لیے بھجوا دیا۔ تب تک وہ پچاس کا ہو چکا تھا۔ اس نے دوبارہ شادی نہیں کی...... زمین سے ہونے والی آمدنی کو وہ فلاحی کاموں میں خرچ کرتا رہتا۔ اس کے اپنے سارے شوق اور سرگرمیاں ختم ہو گئی تھیں۔ گھوڑے پالنے کا شوق...... مرغے لڑانے کا شوق...... میلوں میں جانا...... کبوتر پالنا...... اس نے سب کو چھوڑ دیا۔ جب تک میں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کیا وہ ایک بار پھر علاقے کا ایک بڑا زمیندار بن چکا تھا۔ رزق کے معاملے میں وہ ہمیشہ سے خوش قسمت رہا تھا مگر اس بار وہ معمولی سے کپڑے کے لاچے کرتے میں وہ کئی کئی دن گزار دیتا۔ کھیت پر مزارعوں کے ساتھ کام کرتا، ان کے ساتھ ہی کھانا کھا لیتا۔

میرے اور اس کے درمیان کبھی پچھلے واقعات کے بارے میں بات نہیں ہوئی۔ جب تک وہ زندہ رہا اس نے کبھی ماں، بہنوں یا بھائیوں کا نام تک نہیں لیا اور نہ ہی میں نے کبھی لیا۔ ہم دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو بھی بہت کم ہوتی تھی۔ میں لاہور سے گاؤں جاتا وہ میرا حال احوال پوچھتا، میں جواب دیتا، وہ کھانے کا کہتا پھر باہر نکل جاتا۔ جس دن مجھے واپس آنا ہوتا، وہ میرے لیے کچھ چیزیں تیار کروا دیتا، کچھ نوٹ تھماتا اور تانگے پر بٹھا دیتا۔ ہر ماہ لاہور آتا، مجھے ہاسٹل میں ملتا پھر وہی چیزیں کپڑے اور روپے دے جاتا۔ ہم دونوں بڑی خاموشی سے ایک دوسرے کے سامنے نظریں جھکائے بیٹھے رہتے پھر وہ چلا جاتا۔

ماسٹرز کے بعد میں نے انگلینڈ مزید تعلیم کے لیے جانے کی خواہش کی، وہ مان گیا۔ جانے سے پہلے اس نے میری شادی کرنے کی خواہش کی، میں مان گیا۔

اس نے مجھ سے میری پسند پوچھی۔ میں ایک گھنٹہ سر جھکائے کسی ایسی لڑکی کے بارے میں سوچتا رہا جو مجھے پسند ہوتی۔ تصور میں کسی لڑکی کی شبیہ نہیں آئی میں نے کہا۔ "کسی بھی تعلیم یافتہ لڑکی سے میری شادی کر دیں۔" چوتھے دن سلیمہ بانو سے میرا نکاح ہوا، آٹھویں دن میں انگلینڈ آ گیا دو ماہ کے بعد وہ بھی انگلینڈ آ گئی۔

سلیمہ گورنمنٹ کالج لاہور کی تعلیم یافتہ تھی۔ میں بعض دفعہ سوچتا ہوں اگر وہ میری زندگی میں نہ آتی تو کیا ہوتا۔ وہ واقعی میری نصف بہتر ہے۔ اس نے میری زندگی کے بہت سے خلاؤں کو پر کیا، وہ جتنی اچھی بیوی ثابت ہوئی اتنی ہی اچھی بہو تھی۔ میرے پی ایچ ڈی کے دوران مجھے اپنے باپ کی بیماری کی اطلاع ملی، میں اپنی تعلیم چھوڑ کر واپس نہیں جا سکتا تھا اور میرا باپ میرے پاس آنے پر تیار نہیں تھا۔ درمیانی راستہ سلیمہ نے نکالا۔ وہ میرے دو سالہ بیٹے کو لے کر لندن سے پنجاب کے اس گاؤں میں چلی گئی، جہاں بجلی تھی نہ ہی صاف پانی۔

اگلے دو سال اس نے وہیں میرے باپ کے ساتھ گزارے۔ دو سال بعد میرے باپ کا انتقال ہو گیا تو وہ میرے ساتھ واپس لندن آ گئی کیونکہ میرا ڈاکٹریٹ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ میرے باپ نے مرنے سے پہلے گاؤں میں موجود اپنی ساری زمین مزارعوں میں بانٹ دی۔ اس نے ایسا کرنے سے پہلے مجھ سے اور سلیمہ سے اس کی اجازت لی، مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔

"یہ آپ کا اور ابو کا معاملہ ہے مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔" سلیمہ نے میرے اجازت لینے پر کہا۔

آٹھ سال تک انگلینڈ رہنے کے بعد میں واپس پاکستان آ گیا۔ یہاں آ کر مجھے پنجاب یونیورسٹی میں جاب مل گئی۔ جو کچھ میں انگلینڈ چھوڑ آیا تھا اس کے سامنے یہ جاب اور سہولتیں کچھ بھی نہیں تھیں مگر میں پھر بھی خوش اور مطمئن تھا۔ میں اپنے ملک کو وہ سب کچھ لوٹانے آیا تھا جو اس نے مجھے دیا تھا اور یہاں واپس آنے کے بعد پہلی بار یہ جملہ میں نے اپنے ایک کولیگ کی بیوی سے 1963ء میں سنا جب وہ ہمارے گھر کھانے کی ایک دعوت پر آئے۔ میں چپ چاپ اس عورت کا چہرہ دیکھتا رہا۔ لفظ میرے اندر موم کی طرح گھل گئے تھے۔

"اس ملک میں کچھ بھی نہیں ہے۔"

میں نے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی ہوئی اس عورت کو دیکھا جو زرق برق کپڑوں میں ملبوس تھی، جس کے ہاتھوں میں بہت سے زیور تھے۔

اس ڈائننگ ٹیبل کو دیکھا جو کھانے کے بہت سے لوازمات سے بھری ہوئی تھی اور پھر

اس عورت کی بھری ہوئی پلیٹ کو دیکھا...... پھر مجھے دو چادروں میں بیے ہوئے اپنے بھائی کی لاش کے ٹکڑے یاد آئے آگ سے جلتے ہوئے گھر میں اپنی دونوں بہنوں کی چیخیں یاد آئیں۔

مٹی کی وہ پوٹلی یاد آئی جو میرے باپ نے مرنے سے پہلے سلیمہ کو اپنے پاس رکھنے کے لیے دی تھی۔ میری بھوک ختم ہو گئی، میں نے چاولوں سے بھرا ہوا چمچ دھیرے سے پلیٹ میں الٹا دیا۔

"کسی بھی ملک میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ہر ملک زمین کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے۔ اصل چیز اس زمین کے ٹکڑے پر بسنے والے لوگوں کے اندر ہوتی ہے، خامی ہمیشہ ان لوگوں کے اندر ہوتی ہے، اور یہ خامی اس ملک کا تعارف بن جاتی ہے۔ ایسا سائن بورڈ جسے پھر وہ ملک اٹھائے پھرتا ہے۔"

میں خاموش رہا تھا مگر سلیمہ خاموش نہیں رہی۔ بڑے پر سکون اور ٹھنڈے لہجے میں اس نے اس عورت سے کہا۔ اس بار خاموشی اس عورت پر چھائی ہوئی تھی۔ میں نے اپنی بیوی کو مشکور نظروں سے دیکھا جو اب میرے کولیگ کو ایک ڈش سرو کر رہی تھی۔



میرا باپ دو سال بیمار رہا تھا، اس کی وفات پر میں پاکستان آیا تب اسے دفنایا جا چکا تھا۔ میں نے اس کا بھی چہرہ نہیں دیکھا...... میں رویا بھی نہیں...... کئی دن میں خاموش رہا۔ سلیمہ نے کوشش کی کہ وہ مجھ سے میرے باپ کے بارے میں بات کرے مگر میں ہر بار موضوع بدل دیتا۔ پھر شاید وہ جان گئی کہ میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا۔ اس نے دوبارہ مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔

لندن واپس آنے کے کئی ماہ بعد تک میں اسی طرح گم صم رہا۔ باپ کے مرنے کے بعد میرا پورا خاندان مکمل طور پر ختم ہو گیا تھا۔ ایک عجیب سا احساس تنہائی مجھے ہر وقت اپنی لپیٹ میں رکھتا تھا۔

ایک رات میں نے تین بجے سلیمہ کو جگا دیا۔ وہ پریشان ہو گئی۔

"کیا بات ہے؟ آپ ٹھیک تو ہیں؟"

"ہاں میں ٹھیک ہوں...... تم مجھ سے باتیں کرو۔"

"کیا باتیں؟" وہ حیران ہوئی۔

"کوئی بھی بات...... کچھ بھی......"

"اچھا......" وہ مجھے پورے دن کی روداد سنانے لگی۔ میں اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ شاہد

کی شرارتوں کے بارے میں بتاتی رہی، میں سنتا رہا۔ ٹی وی پر آنے والے ایک پروگرام کی تفصیلات سناتی رہی پھر وہ تھک کر خاموش ہو گئی۔

"آپ بھی تو کچھ کہیں......" اس نے جیسے شکایت کی۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا سر جھکائے میں نے اس سے کہا۔

"ابا نے...... مرنے سے پہلے...... تم سے...... کچھ کہا...... میرے بارے میں؟" وہ ساکت ہو گئی۔ شاید اسے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔ باپ کی وفات کے دس ماہ بعد میں اس سے پوچھ رہا تھا کہ کیا میرے باپ نے میرے بارے میں کچھ کہا تھا۔

"ہاں......" اس بار میں سن ہو گیا۔ میں ہمت نہیں کر پایا کہ اسے وہ الفاظ دہرانے کے لیے کہوں...... میں بنا پلکیں جھپکائے اسے دیکھتا رہا...... وہ اٹھ کر وارڈ روب کی طرف چلی گئی۔ کچھ دیر وہ وہاں کوئی چیز تلاش کرتی رہی پھر وہ ایک پیکٹ لے کر میری طرف چلی آئی۔ میرے قریب بیڈ پر بیٹھ کر اس نے پیکٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر ایک پوٹلی نکال لی، میرا سانس رک گیا۔ میں اس کپڑے کو ساری عمر فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ وہ وہی کپڑا تھا جسے میں نے اپنے بھائی اور ماں کی لاشیں گھر لاتے وقت اپنے باپ کے کندھے پر خون سے لتھڑا ہوا دیکھا اور جس سے میرے باپ نے میرے بھائی کے جسم سے مٹی اور تنکے صاف کیے تھے اور پاکستان واپس آنے کے بعد اسی میں میرے باپ نے ایک مٹھی مٹی ڈال کر اپنی جیب میں رکھ لی تھی۔ میں نے اس کے بعد وہ کپڑا اپنے باپ کے کندھے پر کبھی نہیں دیکھا، اور آج اتنے سالوں کے بعد وہ پوٹلی میری بیوی کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے وہ پوٹلی میری طرف بڑھا دی۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے اسے پکڑ لیا۔

"انہوں نے کہا تھا، جمال سے کہنا واپس ضرور آئے۔ میں نے اس مٹی کے رزق سے اس کی پرورش کی ہے۔ اس پر فرض ہے کہ وہ یہ رزق میری مٹی کو لوٹا دے۔" میں گم صم اپنی بیوی کو دیکھتا رہا۔

وہ میرے رونے کی رات تھی۔ اس رات میں رویا تھا...... اسی طرح جس طرح میرا باپ زمین سے لپٹ کر روتا رہا تھا۔ میں جان گیا تھا، وہ مٹی میرے لیے رکھی گئی تھی۔ میرا باپ جو ساری عمر ہندوستان اور کانگریس کے گن گاتا رہا...... سردار پٹیل، مولانا ابو الکلام آزاد اور گاندھی کی باتیں سنا سنا کر جھومتا رہا۔ وہ مرنے سے پہلے میرے لیے پاکستان کی مٹی چھوڑ کر گیا تھا شاید اپنے بیٹے کے جسم کے ٹکڑے اکٹھے کرتے ہوئے اسے پہلی بار احساس ہوا ہو گا کہ مذہب کی بنیاد پر کھڑا کیا ہوا دو قومی نظریہ دیوانے کی بڑ نہیں، حقیقت تھی۔ شاید میری ماں کی کٹی

ہوئی گردن درخت سے اتارتے ہوئے اسے احساس ہوا ہوگا کہ آزادی کیا ہوتی ہے۔ شاید شکیلہ باجی کی لاش، ڈھانپتے ہوئے اسے پتا چلا ہوگا کہ ہندو کا پالتو کتا بن جانے کا مطلب کیا ہے اور شاید میری دونوں بہنوں کو گھر میں جلاتے ہوئے اسے پتا چلا ہوگا کہ آزادی، قربانی مانگتی ہے۔ حاصل کرنے کے لیے بھی اور قائم رکھنے کے لیے بھی۔

ڈاکٹریٹ کے بعد میں نے کچھ عرصہ انگلینڈ میں ایک یونیورسٹی میں پڑھایا اور پھر واپس آگیا۔ اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق، کوئی دوسری سوچ میرے ذہن میں نہیں آئی۔ کوئی پاؤنڈز میرے پیروں میں نہیں لپٹے، گھر اور گاڑیاں میرے خوابوں میں نہیں آئیں اور نہ ہی سلیمہ نے مجھ سے وہاں رکنے کے لیے کہا۔



پھوار بند ہوگئی ہے، میں نے چند گہرے سانس لے کر اس تازہ ہوا کو اپنے اندر اتارا۔ میرے قدم ایک بار پھر تیز ہوگئے۔ سڑک پر اب بھی لوگ نظر آرہے ہیں۔ بارش کے آثار نے کسی کو بھی پریشان نہیں کیا، ظاہر ہے یہ سردیوں کی بارش نہیں ہے۔ اب میرے سامنے علیم الدین ہاشمی چست چال چلتے ہوئے آرہے ہیں۔ ان کے پیچھے رائفل ہاتھ میں لیے ان کا گارڈ بھی ہے۔ ان کے ہاتھ میں ایک موبائل ہے۔ جس پر وہ بات کررہے ہیں۔ ان کا بیٹا یونیورسٹی میں میرا اسٹوڈنٹ رہ چکا ہے۔ وہ دور سے مجھے دیکھتے ہوئے مسکراتے ہیں اور سر کے اشارے سے سلام کرتے ہوئے فون پر بات جاری رکھتے ہیں۔ میں بھی سر کے اشارے سے ان کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔ وہ فون پر کسی سے کہہ رہے ہیں۔

''لاء اینڈ آرڈر تو تباہ ہوگیا ہے اس ملک میں، اکیلے نکلنے کی تو ہمت ہی نہیں ہوتی۔ پچھلے ماہ پی ایس او کے مینجنگ ڈائریکٹر شوکت مرزا کا قتل ہوگیا۔ ڈیڑھ ہفتہ پہلے صدر صاحب کہہ رہے تھے کہ میں اس ملک کے بارے میں کیا کروں...... میرا بس نہیں چلتا۔ آپ خود سوچیں اگر صدر یہ کہے کہ میں شوکت مرزا کی بیوی سے افسوس کرتے ہوئے اسے یہ یقین دہانی بھی نہیں کرواسکا کہ قاتل پکڑے جائیں گے یا نہیں، تو میرا اور آپ کا کیا ہوگا۔ ہم اور آپ تو کس کھیت کی مولی ہیں۔''

وہ اب میرے پاس سے گزر رہے ہیں۔ ''اب اس طرح کے کولڈ بلڈڈ مرڈرز کے بعد اس ملک میں رہنے کو کس کا دل کرتا ہے۔'' وہ میرے پاس سے گزر گئے ہیں۔

پاکستان واپس آنے کے بعد میں یونیورسٹی میں ہی پڑھاتا رہا۔ میرے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ انگلینڈ جیسی سہولتیں میرے پاس نہیں تھیں مگر سلیمہ نے بھی شکوہ نہیں کیا۔ اس

نے بڑے سلیقے اور طریقے سے میرے پانچوں بچوں کی پرورش کی۔ بچے بڑے ہوگئے، ان کی تعلیمی ضروریات بڑھنے لگیں تو اس نے خود بھی ایک اسکول میں جاب کرلی۔ میرے پانچوں بچے تعلیمی میدان میں بہت اچھے تھے۔ بڑے دونوں بیٹے بہت جلد ہی اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ چلے گئے۔ ان دونوں کی پیدائش وہاں ہوئی تھی اور ان کے پاس نیشنیلٹی تھی، وہ ہائی اسکول کے بعد ہی وہاں جاکر کام کرنے کے ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کرتے رہے۔ سب سے بڑے بیٹے نے لندن اسکول آف اکنامکس سے ڈگری حاصل کی، دوسرے نے بھی وہیں سے تعلیم حاصل کی۔ بڑے بیٹے کا تعلیمی ریکارڈ بہت شاندار تھا اس لیے تعلیم کے دوران ہی اسے اقوام متحدہ کی ایک ایجنسی کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل گیا اور بعد میں وہ مستقل طور پر اس کے ساتھ وابستہ ہوگیا۔ خلیق بھی ڈگری حاصل کرنے کے بعد لندن ہی میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کرنے لگا۔ بڑی بیٹی ایم بی ایس کرنے کے بعد ان دونوں کے پاس چلی گئی۔ وہاں اس نے سپیشلائزیشن کی۔ چھوٹی بیٹی فزکس میں ایم ایس سی کرنے کے بعد ایک کالج میں پڑھانے لگی۔ سب سے چھوٹا بیٹا نعمان...... ہاں وہ...... پاک فوج میں تھا۔ دو سال پہلے کارگل میں شہید ہوگیا۔



میرا سانس کافی تیز ہوگیا ہے۔ اگر ہوا اتنی ٹھنڈی نہ ہوتی تو اب تک پسینے سے بھیگا ہوتا۔

''تیز چلتے ہوئے جب تک پسینہ نہ آئے آپ سمجھیں آپ کو چلنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ یہ سمجھیں آپ نے واک کی ہی نہیں۔'' میرے کانوں میں کسی کی آواز لہرائی۔ آواز نہیں تھی ہدایت تھی، کس کی تھی؟ میں مسکرایا۔

بڑے بیٹے شاہد نے لندن میں اپنی مرضی سے اپنی ایک پاکستانی کلاس فیلو سے شادی کی، فائقہ سلمان...... اچھی لڑکی ہے...... ملنسار...... مہذب، سمجھدار، خوبصورت، خاندانی...... مگر مادہ پرست۔ ان دونوں کے دو بیٹے ہیں۔ آج کل شاہد اور فائقہ چھوٹے بیٹے زبیر کے ساتھ میرے پاس آئے ہیں۔ چند روز رہنے کے لیے۔ شاہد مستقل طور پر پاکستان آنے کے لیے تیار نہیں ہوا، میرے سمجھانے کے باوجود بھی۔

''یہاں میرا کوئی فیوچر نہیں ہے بابا...... ! میں بہت آگے جانا چاہتا ہوں۔ یہ ملک ہر لحاظ سے پیچھے ہے۔ کبھی کبھار آنے کے لیے ٹھیک ہے مگر ہمیشہ کے لیے نہیں۔ ویسے بھی فائقہ اسی شرط پر مجھ سے شادی پر تیار ہوئی ہے کہ ہم ہمیشہ باہر ہی رہیں گے۔ امریکہ ہو یا

یورپ کا کوئی بھی ملک مگر پاکستان نہیں۔ جو معیار زندگی ہم چاہتے ہیں، وہ یہ ملک ہمیں دے ہی نہیں سکتا۔"

میرے بڑے بیٹے کی کئی سال پہلے کی صاف گوئی وہ پہلا جھٹکا تھا جو مجھے اور سلیمہ کو لگا۔ کئی دن ہم دونوں ایک دوسرے سے نظریں چراتے رہے۔ ہمیں بے یقینی تھی کہ ہمارا بیٹا یہ سب کہہ رہا تھا۔ اس وقت ہمارے تین بچے باہر تھے اور دو ہمارے ساتھ تھے۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ ان دونوں کو باہر نہیں بھیجیں گے۔ خوش قسمتی سے میرے دونوں چھوٹے بچوں نے بھی اس پر اعتراض نہیں کیا۔

میری بڑی بیٹی عالیہ کی منگنی میرے ایک کولیگ کے بیٹے سے ہو چکی تھی وہ بھی وہیں انگلینڈ میں سپیشلائزیشن کے لیے جانے والا تھا اور ہمارا خیال تھا ہم ان دونوں کی جلد ہی شادی کر دیں گے۔ دوسرے بیٹے خلیق سے بات کرنے کے بعد سلیمہ نے اس کی منگنی اپنی بہن کی چھوٹی بیٹی سے کر دی جو ایک کالج میں پڑھا رہی تھی۔ شاید یہ ایک حفاظتی قدم تھا۔ ہمارا خیال تھا یہاں کی لڑکی سے شادی کے بعد وہ مستقل طور پر باہر سیٹل ہونے کا نہیں سوچے گا۔ وہ اسے پاکستان لے آئے گی۔ ایسا نہیں ہوا، صالحہ سے شادی کے کچھ عرصہ کے بعد خلیق نے بھی یہی کہا کہ وہ پاکستان سیٹل ہونا نہیں چاہتا۔ اس بار سلیمہ نے اپنی بہن کے ذریعے اپنی بہو پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی مگر اس کی بہن نے سلیمہ سے کہا۔

"صالحہ پاکستان میں رہنا نہیں چاہتی...... یہاں کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے...... زبردستی ان لوگوں کو واپس بلانے کی کیا ضرورت ہے۔ ان لوگوں نے پاکستان کی خدمت کا ٹھیکہ تو نہیں اٹھا رکھا اور میرا خیال ہے میری بیٹی سمجھدار ہے، وہ بالکل صحیح کہہ رہی ہے۔ اس کے کچھ خواب ہیں...... پاکستان آخر دے کیا سکتا ہے ان دونوں کو...... تم دوبارہ اس سلسلے میں مجھ سے بات نہ کرنا...... وہ دونوں میاں بیوی اپنے مستقبل کے بارے میں زیادہ بہتر طریقے سے سوچ سکتے ہیں۔"

سلیمہ بہن کے گھر سے بالکل خاموشی سے واپس آ گئی۔ اگلے دو ہفتے وہ بیمار رہی۔ اس کا بخار اترنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ میں جانتا تھا یہ بخار نہیں تھا، یہ بے بسی اور شرمندگی تھی۔ اس کا خیال تھا وہ اولاد کی اچھی تربیت نہیں کر پائی۔

صدیقہ ہماری چھوٹی بیٹی ہے۔ اس کی شادی ہم نے اس کی مرضی سے کی۔ اس کا ایک کلاس فیلو اعظم تھا جو فزکس میں ڈگری حاصل کرنے کے بعد اٹامک انرجی کمیشن کے ساتھ منسلک ہو گیا۔ مالی طور پر وہ کسی بہت امیر کبیر خاندان سے تعلق نہیں رکھتا تھا مگر اچھا لڑکا تھا اور

پھر صدیقہ کو پسند تھا۔ دونوں بہت اچھی زندگی گزار رہے تھے۔

بڑی بیٹی عالیہ بھی کچھ عرصہ باہر رہی پھر عبداللہ کے ساتھ شادی کے بعد واپس پاکستان آ گئی۔

چھوٹے بیٹے نعمان نے بھی اپنی پسند سے شادی کی۔ اس کی بیوی کرن شروع سے اس کے ساتھ اسکول میں پڑھتی رہی۔ دونوں خاندان بہت اچھی طرح ایک دوسرے سے واقف تھے۔

ایف ایس سی کے بعد نعمان آرمی میں چلا گیا اور پھر جب وہ اکیڈمی سے پاس آؤٹ ہوا تو ہم نے ان کی شادی کر دی۔ آرمی میں جانا نعمان کی اپنی خواہش تھی۔ باقی بچوں کی طرح ہم نے اسے بھی اپنی مرضی کا پروفیشن چننے کا اختیار دیا اور ہاں میں نے اسے آرمی جوائن کرتے ہوئے مٹی کی وہ پوٹلی بھی دی تھی۔

وہ فوج میں میجر کے طور پر کام کر رہا تھا جب کارگل کی جنگ شروع ہوئی اور وہ ان آفیسرز میں شامل تھا جنہوں نے کارگل آپریشن کے لیے خود کو رضاکارانہ پیش کیا تھا۔ وہ ان فوجیوں میں شامل تھا جو کارگل کی جنگ شروع ہونے سے بہت پہلے سردیوں کے موسم میں ان پہاڑوں پر قبضہ کرنے گئے تھے جنہیں برف باری شروع ہونے سے پہلے ہر سال انڈین فوج چھوڑ کر چلی جاتی تھی۔

"ہم کشمیر کو ہائی لائٹ کرنے کے علاوہ اور کچھ کرنا نہیں چاہتے۔ ان چوٹیوں پر ہم قبضہ کر سکتے ہیں۔ مگر ہم جب تک وہاں رہیں گے دنیا اس علاقے کو دیکھتی رہے گی۔ اس کے بارے میں بات کرے گی۔ ان لوگوں نے اس علاقے میں کئی بار بارڈر کراس کیا ہے کہ اب یہ خود کو سورما سمجھنے لگے ہیں۔ جب ان کا دل چاہے گا، یہ منہ اٹھا کر ادھر گشت کرنے نکل پڑیں گے۔ ایک بار ہم ان کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اب اگلی دفعہ یہ کوشش ان کو کتنی مہنگی پڑے گی۔ میں چاہتا ہوں آپ مجھے دعا دیں کہ میں شہید ہو جاؤں۔"

جانے سے ایک رات پہلے نعمان نے مجھے یہ سب کچھ کہا تھا۔

"آپ امی اور کرن کو کچھ مت بتائیں، میں کرن سے صرف یہ کہہ کر جا رہا ہوں کہ ایکسر سائز پر جا رہا ہوں۔ چند ماہ لگ جائیں گے مگر ہو سکتا ہے میں دوبارہ کبھی نہ آ سکوں۔ کرن میرے فون کا انتظار کرے گی، مگر آپ کسی نہ کسی بہانے سے اسے ٹالتے رہیے گا۔ کبھی بہلا دیا کیجیے گا کہ آپ نے مجھ سے فون پر بات کی تھی یا اگر وہ گھر سے باہر ہو تو آپ کہہ دیں کہ میں نے فون کیا تھا۔"

میں اسے شہادت کی دعا نہیں دے سکا۔ میں اتنا بہادر باپ نہیں تھا مگر میں نے اسے کامیابی کی دعا دی...... بعد میں مجھے احساس ہوا شہادت ہی اس کی کامیابی تھی۔

اگلے کئی ماہ گھر سے اس کا رابطہ منقطع رہا اور میں اسی طرح کرن کو بہلاتا رہا۔ سردیاں ختم ہونے کے بعد انڈین آرمی نے دوبارہ ان مورچوں کی طرف جانے کی کوشش کی جن کو وہ سردیوں میں خالی کر آئے تھے اور تب انہیں احساس ہوا کہ وہ مورچے خالی نہیں تھے وہاں پر کچھ لوگ موجود تھے۔ ان کے الزامات ٹھیک تھے، یہ مجاہدین نہیں ہو سکتے تھے۔ ہزاروں فٹ اونچی برف کی بنجر چوٹیوں کو اسلحے سمیت سردیوں میں سر کرنے والے غیر تربیت یافتہ مجاہدین کیسے ہو سکتے تھے۔ ہندوستان کی چیخ و پکار شروع ہو گئی۔ ٹی وی چینلز اور اخبارات نے طوفان اٹھا دیا اور پھر ایک دن میری بہو کرن نے مجھ سے پوچھا۔

''ابو! نعمان کارگل میں ہے نا؟'' میں بول نہیں سکا۔

اس نے دوبارہ کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ اٹھ کر چلی گئی۔ فوجیوں کی بیویاں سوالات کرنے کی عادی نہیں ہوتیں یا کم از کم اس طرح کے سوالات۔

''اگر ہندوستان 71ء میں مکتی باہنی کے روپ میں اپنی فوج کے ٹرینڈ گوریلے مشرقی پاکستان بھیج سکتا ہے، اگر وہ 80ء کے عشرے میں سری لنکا میں لبریشن ٹائیگرز آف تامل ایلام کے لوگوں کے ساتھ لڑنے کے لیے اپنی فوج کا اسلحہ اور فوجی بھیج سکتا ہے تو پھر پاکستان بھی مجاہدین کے روپ میں اپنے فوجیوں کو بھیج سکتا ہے۔ کمینے اور مکار دشمن سے کمینگی اور مکاری کے ساتھ ہی نپٹا جا سکتا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ نعمان وہاں لڑ رہا ہے اور جن لوگوں کے لیے لڑ رہا ہے وہ میرے ملک کا ایک حصہ ہیں۔ لندن میں بیٹھ کر پاؤنڈز سے اکاؤنٹ بھرنے والے تمہارے اور تمہارے شوہر جیسے مادہ پرست اس چیز سے واقف ہو ہی نہیں سکتے۔''

کارگل کی جنگ باقاعدہ شروع ہوتے ہی شاہد اور اس کی بیوی فائقہ نے بھی لندن سے ہمیں فون کیا تھا۔ انہیں نعمان کے بارے میں پتا چل چکا تھا۔ فائقہ نے بات کرتے ہوئے پاکستانی حکومت اور آرمی پر تنقید کی کہ وہ جان بوجھ کر اپنے ریگولرز کو ایک غلط کام کے لیے استعمال کر رہے ہیں اور میں...... میں...... اپنا غصہ ضبط نہیں کر سکا۔ وہ میری باتیں سن کر خاموش ہو گئی۔

جون کے مہینے میں کارگل کے پہاڑوں سے نعمان کی شہادت کی خبر مل گئی۔ صرف خبر، لاش نہیں...... پہاڑ لاشیں واپس نہیں کیا کرتے۔ وہ وہیں کہیں برف میں دفن ہے یا پھر شاید کسی کھائی میں...... میں نے اور سلیمہ نے صبر کیا۔ ہمارے لیے یہ کام آسان تھا، ہمیں

عادت تھی، مگر کرن اور اس کے بچوں کے صبر نے ہمیں حیران کیا۔ نعمان کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے، جانے سے پہلے وہ انہیں ہمارے پاس ہی چھوڑ کر گیا۔

اسی سال جولائی میں پاکستان کے وزیر اعظم امریکہ جا کر وہ معاہدہ کر آئے جس نے میرے جیسے بہت سے لوگوں کے زخموں پر نمک چھڑک دیا۔ کیا ہمارے بیٹوں نے جانیں دیں کہ ان جیسے سیاستدان اپنی کرسیاں بچانے کے لیے اس طرح کے سودے کرتے پھریں۔ میں کئی دن یہی سوچ کر روتا رہا، مگر کیا اس سب کے بعد پاکستان چھوڑ کر چلا جاتا۔ میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو شاید یہی کرتا۔ میں نے یہ نہیں کیا، کرن اپنی دونوں بیٹیوں اور بیٹے کے ساتھ ہمارے ساتھ رہ رہی ہے۔ وہ اب ایک اسکول میں پڑھاتی ہے۔ اس کا بڑا بیٹا حیدر آٹھ سال کا ہے، ایک بیٹی چھ سال کی اور ایک چار سال کی۔ حیدر ہر وقت مجھے ہدایات دیتا رہتا ہے، کبھی کبھار وہ صبح میرے ساتھ واک پر آتا ہے اور اس وقت اسے میری چال پر اعتراض رہتا ہے۔

''تیز چلتے ہوئے جب تک پسینہ نہ آئے آپ سمجھیں چلنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہوا بلکہ یہ سمجھیں کہ آپ نے واک کی ہی نہیں۔ دادو تیز چلیں...... میری طرح کوئیک...... اسی لیے تو آپ فٹ نہیں رہتے...... دادو کوئیک......''

وہ میرے آگے آگے چلتا ہوتا رہتا ہے، میں اس کے ساتھ قدم ملانے کی پوری کوشش کرتا ہوں مگر تھک جاتا ہوں۔ دانستہ...... وہ میرا مستقبل ہے، میرے پاکستان کا مستقبل...... اپنے مستقبل کو کون ہرانا چاہے گا۔

چند دن پہلے وہ میرے پاس ایک پیکٹ لے کر آیا۔ ''آپ کو ایک چیز دکھاؤں دادو؟'' اس نے آ کر کہا۔ میں نے اخبار تہہ کر دیا۔

''ہاں دکھاؤ......'' برق رفتاری سے اس نے پیکٹ کھولا اور اس کے اندر موجود چیز میرے سامنے کر دی۔ میرا سانس رک گیا۔ وہ پونی نسلوں کا سفر کتنی آسانی سے طے کر رہی تھی۔ میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے اسے ہاتھ میں اٹھا لیا۔

''یہ تمہیں کہاں سے ملی؟'' میں نے اپنی آواز کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''پاپا نے دی تھی جب وہ کارگل جا رہے تھے، انہوں نے کہا تھا یہ گفٹ ہے اپنے دادا سے پوچھنا یہ کیا ہے؟ دادو یہ کیا ہے......؟''

میں نے حیدر کو گود میں لے لیا۔

میں نے گھڑی دیکھی اور واپس مڑ گیا۔ اب مجھے واپسی کا فاصلہ طے کرنا تھا اسی

سڑک پر۔

آج کل شاہد اور فائقہ اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ میرے پاس آئے ہوئے ہیں۔ کل چودہ اگست کو سارا دن ٹی وی آن رہا، رات کو شاہد مجھ سے کہنے لگا۔

''میں سوچتا ہوں ابو! بڑھاپا پاکستان میں ہی گزاروں۔ ساٹھ ستر سال عمر میں یہاں آ جاؤں گا۔ انسان کو دفن اپنی مٹی میں ہی ہونا چاہیے۔ ہے نا......؟''

وہ مجھ سے اپنی ''حب الوطنی'' کی داد چاہ رہا تھا۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا اور کہا۔

''پاکستان کو تمہاری قبروں اور تابوتوں کی ضرورت نہیں ہے۔ پاکستان کو تمہاری جوانی اور وہ گرم خون چاہیے جو تمہاری رگوں میں خواب اور آئیڈیلزم بن کر دوڑتا ہے۔ اگر پاکستان کو اپنی جوانی نہیں دے سکتے تو اپنا بڑھاپا بھی مت دو...... جس ملک میں تم جینا نہیں چاہتے وہاں مرنا کیوں چاہتے ہو...... باہر کی مٹی کی ٹھنڈک مرنے کے بعد برداشت نہیں ہوگی تب اپنی مٹی کی گرمی چاہیے؟ نہیں شاہد جمال آپ وہیں رہیں جہاں آپ رہ رہے ہیں۔ ہر شخص کے مقدر میں یا وطن ہونا نہیں لکھا ہوتا۔ بعض کے مقدر میں جلاوطنی ہوتی ہے، اپنی خوشی سے اختیار کی جانے والی جلاوطنی۔'' وہ میری بات پر خاموش ہو گیا تھا۔

شاید اس نے سوچا ہو گا میں پچھلی صدی کا آئیڈیلزم کا شکار ایک بوڑھا شخص، اس جدید ترقی یافتہ دور اور ملک کے نشے سے کیسے واقف ہو سکتا ہوں جہاں وہ رہتا ہے۔ تیس سال گزرنے کے بعد جب وہ میری طرح اس ملک میں رہنے کے لیے آئے گا تو اسے احساس ہو گا، زندگی میں بعض دفعہ جان بوجھ کر آہستہ چلنے میں مزہ آتا ہے۔ بعض دفعہ ریس میں حصہ نہ لے کر بھی آپ اسی کا حصہ رہتے ہیں۔ پھر میری طرح اس سڑک پر واک کرتے ہوئے وہ لوگوں کے چہرے اور چیزیں دیکھے گا مگر اس کے پاس سوچنے کے لیے مٹی کی وہ پوٹلی نہیں ہو گی نہ اس سے وابستہ یادیں۔ اس کے پاس پاؤنڈز اور ڈالرز کے وہ لمبے چوڑے اکاؤنٹ ہوں گے......صرف اکاؤنٹ......!

میں اب سڑک پر تیز رفتاری کے ساتھ واپس جا رہا ہوں، واپسی کا سفر میں ہمیشہ تیزی سے کرتا ہوں۔ واپسی کا سفر ہر ایک ہی تیزی سے کرتا ہے۔ بعض دفعہ یہ سڑک مجھے پاکستان لگتی ہے اور ہر روز صبح ایک گھنٹہ کی یہ واک اپنی زندگی کے اڑسٹھ سال، پچھلے 54 سال میں نے اس ملک میں گزارے ہیں، میرے حصے میں یہاں سب کچھ آیا، اس مٹی نے مجھے خواب دیکھنا سکھایا...... پھر اس کی تعبیر دی، میں نے اس مٹی کو ہر بار وہ دیا جو اس نے مجھ سے مانگا، روپے کی دفعہ روپیہ، وقت کی دفعہ وقت، اور خون کی دفعہ خون...... اور مجھے یہ ملک بھی

نانی نہیں لگا۔

مجھے کبھی اس بھوکے، ترقی پذیر، گندے، ٹوٹی سڑکوں والے ملک کا شہری ہونے پر شرمندگی نہیں ہوئی۔ شاید اس وجہ سے کیونکہ میں نے کبھی اس کے مسائل میں اضافہ نہیں کیا۔ میں نے ہمیشہ اسے اپنے پاس موجود سب سے بہترین شے دی۔ آپ میں سے کوئی بھی اس چیز کو نہیں سمجھ سکتا۔ آج آپ سے آپ کا گھر چھین لیا جائے اور پھر آپ لڑتے جھگڑتے میری طرح خون دے کر اس گھر کو واپس لیں تو پھر آپ کو وہ ٹوٹا پھوٹا، گندا گھر جنت سے کم نہیں لگے گا۔ تب آپ کسی کو اس کی دیوار پر ہاتھ تک نہیں رکھنے دیں گے، کہاں یہ کہ کسی کو اندر آنے دیں۔

میں نے اپنے ڈرائنگ روم میں وہ میڈل رکھا ہوا ہے جو نعمان کی شہادت کے بعد دیا گیا تھا۔ شاید یہ میرے وطن کی طرف سے میری ان خدمات کا اعتراف ہے جو میں نے......

ہر سال پندرہ اگست میں اسی طرح اپنے ماضی کے بارے میں سوچتا ہوں۔ اسی سڑک پر چلتے ہوئے لوگوں کی وہی باتیں سنتے ہوئے۔

''اس ملک میں کچھ نہیں ہے...... ہم نے کینیڈا کی امیگریشن کے لیے اپلائی کیا ہوا ہے۔''

"Across the borders we are one"

مجھے اس سب کے باوجود یہیں رہنا ہے۔ یہیں جینا ہے...... یہیں مرنا ہے۔

''کیا آپ میری طرح قربانی دے کر یہاں جینا اور مرنا سیکھ سکتے ہیں۔''

